ڈاکٹر ثمینہ سیف
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین،
سمن آباد، لاہور

Dr. Samina Saif
Assistant Professor of Urdu,
Government Graduate College for Women,
Samanabad, Lahore

”عجائب القصص“ پر ایک تنقیدی نظر

CRITICAL OVERVIEW OF "AJAIB-UL-QISAS"

Abstract: Shah Alam Sani was the son of Aziz-ud-Din Alamgir Sani, who promoted knowledge and etiquette in the royal court. His contributions to the fields of knowledge and literature alongside achievements in the battlefield are profound. He had received a special scholarly education which enabled him to be proficient in Persian, Arabic and other languages. "Ajaib-ul-Qisas" is a Dastan written by Shah Alam, in which the tale of Prince Shujaa ul Shams and Queen Nigaar is told. This is a love story narrated in the style and structure of other long tales and moves forward in a traditional manner. Nonetheless, "Ajaib-ul-Qisas" is considered more important than others. Firstly, it is a work authored by Shah Alam, the Mughal Emperor, himself. Secondly, it provides insightful content about lifestyle, poetic tastes, and court traditions of 18^{th} century. Adding upon that, it is one of the few initial writings of Urdu prose literature in northern India.

Keywords: Shah Alam Sani, "Ajaib-ul-Qisas", Mughal Emperor, Court Traditions, Urdu Language, Initial Writing, Prose, Simple Style of Writing

اُردو داستانی ادب ذہنی اکتساب کے حوالے سے تاریخ وادب کا گراں قدر خزانہ ہے اس میں انسانی زیست کے متعدد پہلوؤں اور آفاقی ادبی رجحانات کا سراغ پنہاں ہے۔مادہ پرستی اور عقلیت کے اس دور میں ان کی آب وتاب کم ہو کر رہ گئی ہے۔دراصل یہ داستانیں ہمارے گم گشتہ ماضی کی تاریخ اور عصری زندگی کی ترجمان ہیں جن میں نہ صرف تہذیبی نقش گری، شرفا کے طرز تکلم، درباری زبان کے چٹخارے کی بو قلمونیاں، ہندو اسلامی ثقافتوں کا اختلاط، انسانی داخلی و خارجی وارداتوں اور کیفیتوں کا عالمانہ شعور اور آفاقی سچائیاں پوشیدہ ہیں بلکہ اس سے اُردو ادب کی نفسیاتی، رومانی، تاریخی، جمالیاتی، تہذیبی، سماجی اور عمرانی بنیادوں کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔اُردو داستانی ادب میں ان گنت داستانوں کا دل پذیر اور دلکش میلہ لگا ہوا ہے جو سدا بہار حسن وجمال کی آب وتاب سے منور ہے۔انھی دل فریب داستانوں میں ایک داستان ”عجائب القصص“ بھی ہے جو زمانے کی گرد میں گم نامی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔یہ شاعر آفتاب عالم ثانی کی تصنیف ہے۔داستان کا سن تصنیف ۱۲۰۷ھ/ ۹۳ء۔ ۱۷۹۲ء ہے، چار جلدوں پر مشتمل اس داستان کی دو جلدیں فی الحال زمانے کے حادثات کی نظر ہو گئی ہیں۔اس داستان کو راحت افزا بخاری نے ترتیب دیا ہے۔

مغلیہ دور کے وقار کا جب جنازہ نکلا تو انھی بدنصیب بادشاہوں میں ایک شاہ عالم ثانی بھی تھا جس کا دور حکومت ۴۷ برس کرب و اذیت میں گذرا۔ عبدالقادر روہیلہ کے ظلم کے نتیجے میں شاہ عالم ثانی کو اپنی آنکھیں کھونا پڑیں۔ شاہ عالم ثانی سیاست میں تو ناکام رہا مگر انھیں قدرت نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ بیک وقت شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔ شاہ عالم ثانی، عزیزالدین عالمگیر ثانی (۱۷۵۹ء۔۱۷۵۴ء) کا بیٹا اور معزالدین جہاں دار شاہ (۱۷۱۳ء۔۱۷۱۲ء) کا پوتا تھا۔ شاہ عالم ثانی کا نام عالی گوہر اور شاہی لقب ابوالمظفر جلال الدین شاہ عالم ثانی تھا۔ شاہ عالم ثانی فارسی، ترکی، عربی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ''عجائب القصص'' کو پڑھنے کے بعد لگتا ہے کہ یہ داستان نامکمل ہے، اس کی باقی جلدیں کہاں ہیں یہ ابھی تک ایک راز ہے۔ شاہ عالم ثانی نے جب یہ داستان لکھی اس وقت وہ روہیلوں کے ہاتھ نابینا ہو چکا تھا۔ داستان پڑھنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ ایک نابینا شخص یہ خود نہیں لکھ سکتا ہے، شاہ عالم نے یہ داستان یقیناً کسی کاتب سے بول کر لکھوائی ہو گی۔ ایک نابینا شخص ایک ضخیم کتاب کو محض کاتبوں کے سہارے لکھوائے تو یہ بھی ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبارت کے تیور شاہانہ ہیں۔

آغاز داستان سے پہلے مصنف نے ایک دیباچہ ''سبب تصنیف و تالیف ایں کتاب مستطاب'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے داستان کا سن تصنیف بارہ سو سات ہجری (۱۲۰۷ھ) اور نام عجائب القصص رکھ کر اس بات کو شعر کی صورت میں یوں ادا کیا ہے:

عجب ہے یہ افسانہ دل فریب	عجب گفتگو ہے عجیب و غریب
فقط برگِ گل سے نہ رنگین ہے یہ	لبِ لعلِ شیریں سے شیریں ہے یہ
کہیں بزم کا اس میں سامان ہے	کہیں رزم اور میدان ہے
کہیں سحر ہے اور کہیں ہے طلسم	عجب میں نے باندھا ہے اس میں طلسم
عجب ہے یہ افسانہ حیرت فزا	جدھر دیکھو عالم ہے تصویر کا
یہ تریاق ہے بہر زہر الم	یہ ہندوستان کا ہے باغِ ارم
بنایا غرض میں نے یہ بوستاں	کہ ہو باعثِ فرحت دوستاں
کرے جو کہ اس باغ میرے کی سیر	دعا دے مجھے عاقبت ہو بخیر (۱)

درج بالا اس شعری اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ عالم ثانی اور ہندوستان کی تہذیب میں داستان گوئی ایک رنگین اور دلچسپ فن ہے۔ دیباچہ کے بعد انھوں نے حمد اور نعت سے باقاعدہ داستان کا آغاز کرتے ہوئے مدح چار یار کے حوالے سے احادیث لکھ کر ان کی محبت واجب قرار دی ہے۔ داستان گوئی میں حمد و نعت، مدح و منقبت اور مناجات و دعایہ سب چیزیں فارسی اور اُردو کی روایت میں شامل ہیں۔ قصہ میں میر تقی میرؔ اور میر دردؔ کے کلیات سے جابجا فارسی اور برج بھاشا کے اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں۔ نیز مصنف کے اپنے برج بھاشا کے گیت اور دوہے اور اُردو فرد، مخمس، مثنویاں اور قطع بھی کثرت سے موجود ہیں۔

''عجائب القصص'' میں دوسری داستانوں کی طرح روایتی عناصر موجود ہیں، یہاں دوسری داستانوں کی طرح مافوق الفطری کردار، طلسمی دُنیا اور اس کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ملک خطا و ختن کے لاولد بادشاہ مظفر شاہ کو درویش کی دعا سے بیٹا ہوتا ہے، اسی طرح بادشاہ کے وزیر کے ہاں بھی منتوں مرادوں سے اولاد نرینہ ہوتی ہے۔ شہزادے کا نام شجاع الشمس اور وزیر زادے کا نام اختر سعید رکھا جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے یار خاص ہوتے ہیں۔ ملک ختن کے متوازی ملک روم میں بادشاہ اور وزیر کے ہاں کافی عرصہ کے بعد نجومیوں کی پیشن گوئی سے

بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شہزادی کا نام ملکہ نگار اور وزیر زادی کا نام مشتری ہے۔ شہزادہ شجاع الشمس خواب میں ملکہ نگار پر عاشق ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد وہی تلاش محبوب میں سمندری سفر، طوفان میں جہاز کا تباہ ہونا، شہزادے کا مصیبت اور بلاؤں میں پھنسنا، آسمان پری اور راحت پری کی مدد کرنا، دیو اور جادو گروں سے واسطہ پڑنا مگر سب سے مقابلے کے بعد فتح یابی پا کر شہزادی تک رسائی حاصل کرنا اور آخر میں شہزادی بیس سوالات کا جواب مانگتی ہے جو شہزادہ اپنی ذہانت اور قابلیت سے حل کر لیتا ہے۔ ابھی شادی نہیں ہو پاتی ہے مگر داستان ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کیا ہوا یہ باقی دو جلدوں میں مذکور ہو گا۔

جہاں تک ''عجائب القصص'' کے اسلوب کی بات ہے تو یہ ایسی نثر میں لکھی گئی تھی جو اُردو نثر کے لیے ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں اس داستان میں عام فہم زبان کا لکھا جانا ایک اچنبھے کی بات ہے۔ ''عجائب القصص'' سے قبل اُردو نثر عربی اور فارسی کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ ''کربل کتھا''، ''نوطرز مرصع'' اور ''قصہ مہر افروز دلبر'' لکھی جا چکی تھیں لیکن ان سب کا اسلوب صنائع و بدائع اور رعایت لفظی سے پُر تھا جب کہ ''عجائب القصص'' کے اسلوب میں سادگی اور عام فہمی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ایک ایسا اسلوب تھا جو آئندہ آنے والے دور کے مذاق کے عین مطابق تھا اور یہی اسلوب مہر چند کھتری کی داستان ''نو آئین ہندی'' اور فورٹ ولیم کالج کی فضاؤں میں پروان چڑھا۔ ''عجائب القصص'' کی نثر ایک ایسا قابل قدر نمونہ ہے جس میں روزمرہ کی بول چال کی زبان نہ صرف معیاری ہے بلکہ شستہ بھی ہے جس کی اپنی ایک عالمانہ شان ہے۔ یوں ''عجائب القصص'' کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے اول تو یہ اٹھارویں صدی کی وہ تصنیف ہے جس نے اُردو نثر کو اپنے بازوؤں پر کھڑا کرتے ہوئے اعتماد بخشا اور شاعری کے دور میں سادہ اور عام فہم نثر کی ترقی و ترویج میں سنگ میل کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے خدوخال تشکیل دیے۔ مزید برآں اس نثر میں قصے کی دلچسپی کو خاطر میں رکھ کر ایک پوری برصغیر کی تہذیب کو زندہ کر کے دکھایا گیا ہے جس میں کرداروں کی زبان میں موقع محل کے مطابق قوت اظہار، رنگارنگی اور جذبات و کیفیات کے تنوع کو بیان کرنے کی قدرت بھی موجود ہے مثلاً ایک مقام پر شہزادہ آسمان پری سے اپنے دل کا مدعا یوں بیان کرتا ہے:

> ''بادشاہ زادے نے کہا ''اے آسمان پری! تم نے اس قدر مجھ پر احسان کیے ہیں اگر طوق قمری کی طرح بندگی کا، گلے میں ڈال کر حاضر تمھاری خدمت میں روز و شب رہا کروں سزاوار ہے۔ اگرچہ تیرے سینکڑوں مجھ پر احسان ہیں لیکن یہ ایک احسان اور سمجھ کر مجھ کو رخصت سفر روم کی دیجیے۔''(۲)

ڈاکٹر گیان چند جین کو ''عجائب القصص'' اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی سلیس اور بامحاورہ لگی، وہ اس داستان کی زبان کو اٹھارویں صدی میں ایک نعمت قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں:

> ''شاہ عالم کی اس اصابت نظر کو سراہا جائے گا انھوں نے عربی فارسی زدہ دقیق طرز نگارش کی جگہ سلیس اسلوب کو پسند کیا۔ مختلف فصلوں کے عنوان فارسی میں ہیں اور ان کی عبارت آرائی و قافیہ پیمائی کا رجحان ہے لیکن اُردو میں وہ مرصع و مصنوعی اسلوب سے حتی الوسع یاد رہتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے عجائب القصص اُردو کی قابل ذکر داستانوں میں شمار کی جائے گی کیونکہ یہ مختلف داستان کے عہد طفولیت کی تخلیق ہے۔''(۳)

جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا ماننا ہے کہ اُردو زبان سلاست و سادگی کے حوالے سے فورٹ ولیم کالج کے احسان تلے دبی ہوئی ہے اگر فورٹ ولیم کالج نہ بھی ہوتا صرف ''عجائب القصص'' ہی لکھی جاتی تو اسی انداز سے اُردو نثر کے ارتقا کا عمل جاری و ساری رہتا۔ انھوں نے ''عجائب القصص'' کے اسلوب کو شستہ، سلیس اور سادہ قرار دیا اور اسے جدید اور معیاری قرار دیتے ہوئے یوں سراہا ہے:

> ''نثر اسلوب میں مزاج کی یہ تبدیلی کوئی ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ یہ اسلوب کی بدلی ہوئی تہذیبی، معاشرتی و سیاسی ہوا اور بدلے ہوئے طرزِ احساس کے عین مطابق تھا یہ وہ تصنیف ہے جس کے ساتھ اُردو نثر پورے طور سے جدید دور میں داخل ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اس میں رچاوٹ، پختگی، سلاست و روانی بھی ہے۔ یہاں نثر شاعری سے الگ اپنا وجود قائم کر لیتی ہے جس کا اپنا مزاج اپنے تقاضے اور انفرادیت ہے۔ اُردو پن کا اسلوب نمایاں ہے۔ اس داستان کی نثر میں بہتے دریا کی روانی اور سادگی و سلاست بھی ہے۔''(۴)

بلاشبہ ''عجائب القصص'' جہاں زبان کے لحاظ سے ''کربل کتھا''، ''نو طرزِ مرصع'' اور اپنے عہد کی تمام داستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے وہیں اس کا طرزِ نگارش دہلی کالج، فورٹ ولیم کالج اور دیگر داستانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا۔

اُردو داستانی ادب میں طلسم و ساحری کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہے۔ انسان جو کام سرانجام نہیں کر پاتا ہے وہ تمام امور یہ جن اور پری سرانجام دیتے ہیں۔ کبھی یہ مافوق الفطرت کردار انسان کے دوست بن کر ان کے لیے مہمات سر کرتے ہیں تو کبھی یہ ان کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں اور بعض داستانوں میں پری کا انسان پر عاشق ہو جانا بھی ملتا ہے۔ ایسے قصے ہمیں ''عجائب القصص'' میں بھی ملتے ہیں۔ شہزادہ ملکہ نگار کی تلاش میں نکلتا ہے تو آسمان پری اس پر عاشق ہو جاتی ہے لیکن وہ شہزادے اور ملکہ نگار کو آپس میں ملواتی ہے اور شہزادے کو ملک روم کی طرف روانہ کرتے ہوئے راستے میں مصائب کو بھی حل کرتی ہے۔ ملک روم کی طرف جاتے ہوئے مہمات کے دوران ریحان پری اور شاہ پری بھی شہزادے پر عاشق ہو جاتی ہیں۔ کہانی میں ایک شہزادہ اور اس کی چار محبوبائیں ہیں جو اس دور کے اخلاقی اقدار کے زوال کا پتہ بتاتی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں مغلیہ شہزادوں کو عیش پرستی کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ وہ اسی میں مگن رہتے تھے۔ یہ داستانی شہزادہ بھی جہاندار شاہ اور محمد شاہ رنگیلا کا علامتی کردار ہے۔ داستان کے تمام نسوانی کردار بھی اپنے عہد سے مطابقت رکھتے ہیں، جیسے اس عہد میں مرد، عورت کے ہاتھوں سے کھیلتا تھا اور عورتوں کو علم تھا کہ مرد کے متعدد معاشقے چل رہے ہیں ایسے میں ''عجائب القصص'' میں دکھایا گیا ہے۔

طلسم کے حوالے سے پری تخت پر بیٹھ کر اڑتے ہوئے سو کوس کی مسافت پل بھر میں طے کر لیتی ہے۔ اس دور میں یہ سب تخیل کی کارفرمائی لگتا تھا۔ مگر عصرِ حاضر میں یہ تخیل ناممکن سے ممکن سائنس نے بنا دیا ہے۔ آج دُنیا کے سارے سائنس فکشن کی بنیاد داستانی ادب پر ہی رکھی ہوئی ہے۔ سائنسی ترقی اور انسانی ذہن کے ارتقا کو سمجھنے میں یہ داستانیں بہت معاون ہیں۔

داستانی ادب میں پلاٹ مفقود ہوتا ہے، دراصل داستان ایک زبانی بیانیہ ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں۔ اگر داستان لکھی بھی گئی ہے تو بھی اس کا مصرف یہی ہے کہ وہ زبانی سنائی جائے۔ بیانیہ کے مختلف روپ ہیں، زبانی بیانیہ میں داستان گو اسلوب پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور پلاٹ پر کم، جس کی وجہ سے وہ اعلیٰ پائے کے کردار بھی تخلیق نہیں کر پاتا ہے اور تکرار کا آ جانا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ یوں داستان کے تصورِ کائنات اور اس کے متعلقات، اجزائے ترکیبی، اصول و ضوابط، رسومیات اور تشکیلی عناصر کو ناول اور افسانے کے قاعدے اور ضابطے سے پرکھنا داستان سے زیادتی کے

مترادف ہے۔ ''عجائب القصص'' کے پلاٹ میں تخیل اور تحیر کی بزم آرائیاں دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ شاہ عالم ثانی نے واقعات کے عمل اور رد عمل سے پلاٹ تشکیل دیا ہے جس میں بڑی حد تک ربط اور نظم موجود ہے۔ طوالت کے باعث تکرار آجانا ایک لازمی عنصر ہے جس کی بدولت اکتاہٹ کا عنصر بھی آجاتا ہے۔ داستان کا پلاٹ بالکل سادہ ہے یہاں قصہ در قصہ کی روایت سے بغاوت کی گئی ہے۔

چوں کہ داستان گو کے نزدیک واقعات کو کردار نگاری پر فوقیت دی جاتی ہے تو وہ زندہ کردار تخلیق نہیں کر پاتا ہے۔ نیز اس کے کردار مثالیت کی بنا پر یک رخے ہوتے ہیں، ان میں ارتقا نہیں ہوتا ہے اور یہ جیسے ہوتے ہیں شروع سے آخر تک ویسے ہی رہتے ہیں۔ ایسے ہی ''عجائب القصص'' کا ہیرو بھی روایتی داستانی ہیرو ہے جو باقی شاہزاروں سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ داستان اس حوالے سے قابل ستائش ہے کہ اس میں مختلف کرداروں کے افعال میں طبقاتی فرق کو پیش نظر رکھ کر مکالمہ نگاری کی گئی ہے۔ جس میں شاہ عالم ثانی نے اپنے ماحول اور عہد کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس ضمن میں ارتضیٰ کریم کا فرمانا ہے:

> ''یہ تمام کردار جس صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے قصہ میں رنگینی، پیچیدگی، تجسس، بوقلمونی اور دلچسپی کا اضافہ ہوتا ہے۔۔۔۔ مجموعی اعتبار سے شاہ عالم ثانی نے عجائب القصص کی کردار نگاری میں ذہنی کاوش اور سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ہر کردار کو اس کے اپنے داستانی پس منظر میں زیادہ خوب صورتی کے ساتھ پیش کر سکے۔''(۵)

ہمارا قدیم کلاسیکی ادب اجتماعی زندگی کے معاملات و مسائل کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں نہ صرف اپنے عہد کے خارجی حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے بلکہ اس میں حالات کے زیر اثر انفرادی طور پر مختلف کیفیات کی نقشہ کشی بھی کی گئی ہے۔ اٹھارویں صدی میں انسانی زندگی اور اس کے جذباتی معاملات و تجربات کو مختلف زاویہ نظر سے ''عجائب القصص'' میں دیکھا گیا ہے۔ شاہ عالم ثانی نے اپنے دور کی شاہی معاشرت اور تہذیبی و مجلسی زندگی کے خوبصورت نقشے کھینچے ہیں۔ تخیل کی کارفرمائی سے اس دور کا ادب، آداب، تہذیب، مغلیہ شاہی معاشرت اور رزم و بزم کا طرز بیان داستان کی دلچسپی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شاہ عالم ثانی نے شاہی معاشرت کی عکاسی یوں کی ہے:

> ''بادشاہ زادہ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نمگیرہ کھڑا ہوا ہے جھالریں موتیوں کی لگی ہوئی ہیں اور چوبیں اس کی نقرہ منبت یاقوت و لعل سے ہیں اور ایک فرش سفید چاندنی کا سراپا صحن میں پاس بام کے بچھا ہوا ہے اور اس نمیگیرے میں ایک پلنگ ہے اس اوپر پلنگ پوش بچھا ہوا ہے اور چنگیریں پھولوں کی دست راست اور دست چپ اور سرہانے اس پلنگ کے دھری ہوئی ہیں۔''(۶)

تہذیبی نقطہ نظر سے اگر ''عجائب القصص'' کو دیکھا جائے تو اس کے اندر متعدد ایسے پہلو اور حوالے موجود ہیں جس سے اس دور کی تہذیب و معاشرت اور ذاتی و مجلسی زندگی کا خاکہ تیار ہو سکتا ہے۔ اپنے عہد کی طرح داستان میں تقدیر اور جبر و قدر کے معاملے میں شہزادہ شجاع الشمس مجبور ہے۔ مختلف مہمات طے کرتے ہوئے جب اس کا سب کچھ لٹ جاتا ہے تب وہ اس کو مقدر کا لکھا ہوا جان کر صبر کر جاتا ہے۔ صبر بھی ایک ایسا رویہ تھا جو اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے عوام کی زندگیوں کا حصہ تھا۔ ایسے ہی ان مہمات میں شہزادہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ہے، وہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ملکہ نگار کو حاصل کرلے گا۔ یہ صبر، یقین اور امید اس دور کی اسلامی تہذیب اور معاشرے

کے رگ وپے میں موجود تھا۔ شاہ عالم ثانی نے جس دور میں آنکھ کھولی تب توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا پورے سماج میں چلن تھا۔ تب جنوں، پریوں اور دیو کو بیماریوں اور بلاؤں سے جوڑنے کا عام رواج تھا اور ایسی ہی مثالیں داستان میں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً وزیر زادی مشتری جب ملکہ نگار کا حال دیکھتی ہے تو حواس باختہ ہو جاتی ہے، تب اس کے منہ سے یہ کلمات ادا ہوتے ہیں:

''مبادا سایہ پری یا نظر کسی جن کی ہو گئی ہو۔''(۷)

یہاں جن وپری کا سایہ اور نظر بد جیسے دو سماجی رویوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ داستان میں شہزادہ دیوالی اور ہولی مناتا ہے تو ہندو اور مسلمان سب شریک ہوتے ہیں اس چیز سے اس دور کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ نیز دعوتوں میں شراب دکھائی گئی ہے جو اس عہد میں عام تھی لیکن شہزادہ مسلمان ہے وہ شراب تو پیتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ مطلق اس کی لذت سے ناواقف ہے، یوں ایک اسلامی معاشرے میں شراب اور اس کے احساسِ گناہ کو سمجھے جانے کا سراغ ملتا ہے۔

''عجائب القصص'' کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مغلیہ دور کے جلال وجمال کی تصویر کشی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس داستان کو ڈاکٹر جمیل جالبی ''کتاب التہذیب'' کا نام دیتے ہوئے اسے ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

''یہ داستان اس رجحان کی پیش رو ہے جس کے اثرات ''طلسم ہوش ربا'' سے لے کر عبدالحلیم شرر کی فردوس بریں تک نظر آتے ہیں۔''(۸)

جب کہ ڈاکٹر محمد خاور جمیل نے شاہ عالم کے تہذیبی سمجھ بوجھ کی مداحی کی ہے۔ انھیں اس دور کی تقدیر پرستی، مایوسی، صبر، توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور موسیقی اس داستان میں جھلکتی نظر آئی نیز انھیں داستان میں بیان کردہ لباس آلات جنگ و حرب، زیورات اور کھانے پینے کے لوازمات اپنے عہد کے ترجمان لگے۔ ڈاکٹر خاور جمیل نے ''عجائب القصص'' کو ''کتاب تہذیب و آداب'' کا درجہ دیا ہے۔(۹)

اس میں ہرگز دورائے نہیں ہے کہ ''عجائب القصص'' اٹھارویں صدی کی وہ قابل قدر اور اہم نثری تصنیف ہے جس کی نہ صرف لسانی حیثیت اُردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی ہے بلکہ یہ آداب سلطنت اور معاشرت کی بہترین مرقع نگار ہے۔ ادب اپنے دور کے معتقدات اور سماجی رویوں کا عکاس ہوتا ہے۔ ''عجائب القصص'' جب لکھی گئی تب مغلیہ تہذیب اور سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا اور عوام میں بھی عمل کی تلوار کند ہو گئی تھی۔

یہ داستان محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں مغلیہ دور کی مدفون تہذیب اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہاں بیس سوالات کو حل کرتے ہوئے شہزادہ شجاع الشمس زندگی کی تراش خراش اور متخیلہ کا خوبصورت بیانیہ پیش کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں بدلتے دور اور رجحانات کے پیش نظر مختلف اصناف ادب کو نئے مفاہیم ملے وہاں داستانی ادب بے اعتنائی کا شکار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بیسویں صدی میں داستانی ادب کو نئے زمانے نے شکست دی، ہندوستانیوں کو اپنی تہذیب پڑھنے اور سمجھنے کے لیے مغرب کی عینک استعمال کرنی پڑی نیز انگریز سیاست اور تربیت نے ہمیں اپنے ورثے پر شرمندہ ہونے کی راہ پر چلایا، یوں جہاں ہمارے تہذیبی تصورات میں تغیر آیا وہاں ادبی تصورات میں بھی انقلاب

آیا۔ ہم نے اپنی داستانوں میں وہ تمام عیب تصور کر لیے جس کی بدولت آج ہم اپنے تہذیبی ورثے سے دور ہو گئے ہیں۔ داستانی ادب کی بازیافت کرتے ہوئے ہم اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی وقار اور ثقافتی شناختوں کو بحال کر سکتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنے داستانی ادب میں گم گشتہ معنویت کی تلاش میں نئے زاویوں اور نئے خیالات و نظریات کو روشناس کرواتے ہوئے اسے جدید دور کے ادب سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ دراصل یہ تمام داستانیں "عجائب القصص" کی طرح ہماری زندگی کی رنگارنگی، الفاظ و اسالیب کے بے مثال اور غیر مختتم خزانے، ہندوستان کی مجلسی زندگی کے رنگین و دلکش دُنیا کے متعدد پہلوؤں اور معاشرت کی متنوع تصویروں کے ارژنگ کا ملخص ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شاہ عالم ثانی۔ عجائب القصص (مرتب: راحت افزا بخاری)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء۔ ص ۲۷

۲۔ ایضاً۔ ص 283

۳۔ گیان چند۔ اُردو کی نثری داستانیں۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۹ء۔ ص ۲۳۵

۴۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو (جلد دوم۔ جلد سوم)۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۱۱۵

۵۔ ارتضیٰ کریم۔ عجائب القصص۔ تنقیدی مطالعہ (جلد اوّل)۔ دہلی: زلالہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء۔ ص ۸۸

۶۔ شاہ عالم ثانی۔ عجائب القصص (مرتب: راحت افزا بخاری)۔ ص ۱۲۴

۷۔ ایضاً۔ ص ۹۷

۸۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو (جلد دوم۔ جلد سوم)۔ ص ۱۱۱۸

۹۔ محمد خاور جمیل۔ شاہ عالم ثانی آفتاب۔ احوال و ادبی خدمات (جلد اوّل)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۷ء۔ ص ۹۳